نذیر احمد کے ناول اور نوآبادیاتی نظام

خالد محمود

ABSTRACT:
Deputy Nazir Ahmad, the forerunner of Urdu Novel, emerges as conscious-raiser in the days of British Colonial rule in India. His novels like; "Mirat ul Uroos", "Taobahtu Nasooh","Binat ul Alnash"and "Ibn ul Waqt" written under the influence of reformation movement of Aligarh, not only survey the contemporary Indian society but also advocate the revival of glorious tradition of enlightened society. The critics of Nazir Ahmad point out his allegiance to the colonizer and the Victorian Ideals but his novel "Ibn ul Waqt" presents a different scene. This article explores the significance of these novels for the portrayal of a historic phase of society particularly the movement for mass education, women's upbringing and social reforms.

جب بھی نوآبادکار کسی ملک یا زمین کو اپنی کالونی بنانے کی سعی کرتے ہیں تو وہاں پہلے سے موجود تمام کا تمام نظامِ زندگی بدل کے رکھ دیتے ہیں ۔برطانوی نوآبادکاروں نے بھی ہندستان سے جہاں تمام اسباب اور وسائل لوٹ لیے وہیں یہاں کا سماجی ڈھانچہ ایسا بدلا کہ آج ، ڈیڑھ دو صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ہم اس کو ـ''ڈی-کلونیلائز'' نہیں کرپائے۔ مزید براں کہ ایسا ہوتا نظر بھی نہیں آرہا۔ہندستان سے اس کی زبانیں چھین لی گئیں اور ان کی جگہ غیر ملکی زبان دی گئی جس میں نوآبادکاروں اور برطانوی اشرافیہ کے اپنے اہداف اور مفادات کے سوا کچھ نہ تھا، مقامی سطح پر انگریزی سکول ،کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہوئیں ،جن میں انگریز مدرّس ،پروفیسر جہاں انگریزی زبان و ادب کی تعلیم دینے لگے وہیں مقامی زبانوں کی تحقیر کا بھی آغازکیا گیا کہ ہندستان کی زبانیں نئے علوم پیدا کرنے کی قابلیت اپنے اندر نہیں رکھتیں ۔ صدیوں پرانے مقامی علوم و فنون کا تمسخر اڑایا گیا اور یہاں کے شعرو ادب کو ''رَدّی'' کہا گیا،حقارت سے یہ تک کہاگیا کہ جس کاغذ پر یہاں کی کتابیں چھپتی ہیں وہ کاغذ ان کتابوں سے زیادہ قیمتی ہے۔

۱۸۵۷ء کے آس پاس کا زمانہ ایساتھا جس میں ہندستانیوں اور خاص کر اسلامیان ہند نے یہ طے کر لیا تھا کہ اب ان کی حکمرانی ، چوں کہ یہاں ختم ہو رہی ہے ، لہٰذا ان کو ان نئے اندازِ زندگی کو اختیار کرنے کی راہیں نکالنی چاہیئیں ، نئی راہوں کا اصول ہے کہ ان پر پرانے اندازِ سفر سے منزل پر نہیں پہنچا جا سکتا ، نئی راہیں نئے اندازِ سفر کو بھی جنم دیتی ہیں ۔اسی زمانے میں یہاں کے باشندوں کی زندگیوں میں جس فکر نے تیزی سے جنم لیا ، وہ مقصدیت کی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد

جب شکست خوردہ قوم کی طرح اسلامیان ہند بھی گہری مایوسی میں جا پڑے تو اس گہری مایوسی سے نکلنے کا واحد راستہ امید پرستی اور زندگیوں کو بامقصد بنانا ہی تھا، یہی وجہ کہ اس دور کی تخلیقات میں بھی جو واضح رجحان دکھائی دیتا ہے ، وہ امید پرستی کو جنم دیتا ہوا مقصدیت کا رویہ ہی ہے۔لیکن، جیسا کہ ہر ادب کی تعبیر کے لیے ہمیشہ ایک سے زیادہ نقطہ ہائے نظر ہوا کرتے ہیں ، اسی طرح اردو ادب کے اس دور کو بھی خاص طور پر کئی انداز سے دیکھا جاتا ہے۔ایک مکتبۂ فکر نذیر احمد کے ناولوں کو خاص طور پر ہندستانی خواتین کی تعلیم اور ان کی آزدیِ فکر کی کوششوں سے جوڑ کر دیکھتا ہے، جب کہ دوسروں کو 'نذیر احمد' ''مولوی نذیر احمد'' دکھائی دیتے ہیں ۔ناقدین ادب کاایک طبقہ ایسا بھی ہے جو نذیر احمد کی تمام تصانیف کو انگریز اور نوآبادیاتی ایجنڈے کے زیر اثر سمجھ کر ، پھر اس کی تعبیر کرتا ہے، بہر حال تمام مکاتب کے اپنے اپنے فکری انداز ہیں ، جو یقینا اردو ادب میں ناول کے مباحث کو کسی نہ کسی سطح پر ترقی ہی دیتے ہیں اور ادب کوبھی، خاص کر اس دور میں لکھے گئے ناولوں کو مختلف زاویۂ نگاہ سے دیکھنے میں قاری کی مدد کرتے ہیں ، فکرکی اسی رنگا رنگی اور اختلاف سے ادبی تنقید میں رونق رہتی اور تنقید میں جمودواقع نہیں ہوتا، سوچیے اگر تمام ناقدین ایک ہی طرح کی بات کرتے رہیں تو بات کب تک چل سکتی ہے اور ادب کو کتنا آگے لے جاسکتی ہے؟

ہندستان کے اُس بحرانی دور میں ، ہندستانیوں نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ اب انھیں اپنی عورتوں کو نئی فکر دینے کے لیے، روایتی تعلیم سے کچھ زیادہ آگے بڑھنا ہو گا، اسی لیے بنگال میں برہموسماج ، بمبئی میں پارسیوں کی آزدیِ فکر،اور ترقی پسندی نے اس فکر کو مہمیز لگایا۔ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ، ''مولوی نذیر احمد دہلوی۔احوال و آثار'' میں اس حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''حسن اتفاق سے ان دونوں صوبوں (پنجاب ،یو پی)میں زمامِ حکومت اور سر رشتۂ تعلیمات کا نظام ایسے انگریزوں کے ہاتھ میں تھا جو علوم و فنون کی اشاعت اور اردو زبان کی ترقی کے لیے خلوص دل سے کوشاں تھے۔حقیقت یہ ہے کہ انگریزی حکومت کی پوری تاریخ میں علم دوست، معارف پرور اور اردو نواز حکام کا ایسا اجتماع پھر کبھی ممکن نہ ہوا پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر سر ڈی-میکلوڈ خود عالم مستشرق اور علوم مشرقیہ کے قدردان تھے۔ ان کی راہنمائی میں ناظم تعلیمات میجرفُلر اور ان کے جانشین کیپٹن ہالرائڈ نے اردو کو علمی و ادبی حیثیت سے ترقی دینے میں بیش بہا خدمات انجام دیں ۔ان انگریز حکام کی کوششوں سے نہ صرف علمی تصانیف کے ترجمے ہوئے اور مدارس کے لیے درسی کتابوں کے نئے سلسلے مرتب کیے گئے بلکہ تعلیم نسواں کی غرض سے خاص قسم کی کتابیں لکھوائی گئیں ۔'')۱(

ڈپٹی نذیر احمد کو کہانی بیان کرنے میں ملکہ حاصل تھا ،انھوں نے اردو ناول کی ابتدائی شکل کو پیش کیا۔ان کا پہلا ناول '' مرأۃ العروس''تھا ، جسے انھوں نے۱۸۶۹ء میں تحریر کیا۔اگرچہ اصلاحی حوالوں سے لکھی جانے والی تحریروں میں اسے اوّلیت تو نہیں دی جاسکتی ، لیکن اس کی اہمیت سے بھی مفر ممکن نہیں ہے۔ اردو ناول بلا شبہ باقاعدہ طور پر سر سیّدکی تحریکِ علی گڑھ کے زیر

اثر ہی لکھا گیا اوراس کے ممکنہ اور مطلوبہ نتائج بھی حاصل کیے گئے۔ ہندستان میں عورتوں کی تعلیم ایک مسئلہ رہی ہے۔ مسلمانوں کے اپنے خیالات ایسے نہ تھے کہ وہ یہاں کی عورتوں کو آزاد خیال یا مردوں کے برابر دیکھنا چاہتے ہوں ۔ہندستان کی تہذیب میں ابھی عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ ، سماجی سطح پر پیداواری عمل میں شریک نہیں رہی تھیں ۔ایک طرح سے ان پرانی ا قدارکی تبدیلی میں بھی سر سیّد کی کوششوں کو ہی عمل دخل حاصل رہا ہے ۔البتہ سرسیّدکی فکر کو لوگوں کے گھروں میں ''بیبیوں اور بچیوں '' تک پہنچانے کا سہرا ڈپٹی نذیر احمد کے سر ہے۔ وہ خود''مرأۃالعروس'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

''لیکن اس کے ساتھ ہی مجھ کو یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ نِرے مذہبی خیالات بچوں کی حالت کے مناسب نہیں ، اور جو مضامین ان کے پیشِ نظر رہتے ہیں ان سے ان کے دل افسردہ ، ان کی طبیعتیں منقبض اور ان کے ذہن کندہوتے ہیں ۔تب مجھ کو ایسی کتاب کی جستجو ہوئی جو اخلاق و نصائح سے بھری ہوئی ہو اور ان معاملات میں جو عورتوں کی زندگی میں پیش آتے ہیں اور عورتیں اپنے توہمات اور جہالت اور کجرائی کی وجہ سے ہمیشہ ان میں مبتلائے رنج و مصیبت رہا کرتی ہیں ، ان کے خیالات کی اصلاح اور ان کی عادات کی تہذیب کرے اورکسی دلچسپ پیرائے میں ہو جس سے ان کا دل نہ اکتائے،طبیعت نہ گھبرائے۔''(۲(

نذیر احمد کاناول'' مرأۃ العروس ''نسوانی اخلاقیات اور تہذیب و تعلیم کی اوّلین کتاب نہیں ہے بلکہ اس سے قبل بھی اس نہج پر کام ہو چکا تھا اورلوگوں میں فکری سطح پر ایسا شعور پایا جاتا تھا کہ ہندستان کی بہو بیٹیوں کو نیک اور شائستہ بنانے کے لیے ایسے نصاب کی ضرورت ہے جو ان کی غیر محسوس انداز سے تربیت کرے اور ان پر اس تربیت کی گرانی کسی اضافی بوجھ کی صورت بھی اختیار نہ کرے۔ بلا شبہ یہ نہایت احسن کام مہذب قوموں کا وتیرہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی عورتوں کو تعلیم اور تربیت سے عاری نہیں رکھنا چاہتیں ۔ عورتوں کی تعلیم آیندہ قوموں اور نسلوں کی تربیت کے کام آتی ہے ، یہ خیالات تو صدیوں سے دنیا میں پسند کیے جارہے تھے، پھر ہندستان میں نذیر احمد کو ایسی کتاب میسر نہ آنا کسی طرح بھی المیے سے کم نہیں ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایک ایسا حوالہ اپنی کتاب میں دیا ہے جسے ایک نظر ضرور دیکھا جانا چاہیے:

''اسی زمانے یعنی ۱۸۶۸ء میں صوبہ شمال مغرب کی حکومت نے ایک اشتہار اخبارات میں شائع کیا جس میں فروغ ادب کے لیے اہل قلم کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ اردو یا ہندی میں ادبی یا سائنٹیفک موضوعات پر کتابیں لکھ کر یا تالیف و ترجمہ کرکے انعام کے لیے پیش کریں ۔بہترین کتاب پر ایک ہزار روپے کی رقم انعام میں دی جائے گی۔نذیر احمد نے اپنی تصنیف ''مرأۃالعروس'' (۱۸۶۹ء)انعام کے لیے پیش کی جس پر ۱۸۷۰ء میں انھیں ایک ہزار روپے کا انعام ملا۔ ''(۳(

اس حوالے سے مذکورہ ناول کی تخلیق ان مقاصد کی رُو سے ، جو نذیر احمد نے پیش کیے ہیں ، مشکوک ہوتی ہوئی نظر آتی ہے اور اس کی تخلیق کا مطمع نظر یکسر مختلف ہوکر رہ جاتا ہے۔ پھر نذیر احمد کا یہ بیان کہ انھیں عورتوں اور لڑکیوں کی اخلاقیات کو بہتر بنانے کے لیے کوئی کتاب ، بعد ازبسیار تلاش بھی نہیں ملی، جہاں ایک المیہ نظر آتا ہے وہیں محققین کی نگاہ میں شبہات بھی

پیدا کرتا ہے جب ۱۸۶۹ء سے پہلے کئی ایسی کتابوں کی موجودگی کا حوالہ مل جاتا ہے، جن کا انکار نذیر احمد کے بیان میں دکھائی دیتا ہے۔

''مرأۃ العروس'' ایک عام ہندستانی کہانی ہے جس میں ایک فارمولے کے تحت ایک بہن کو جو عمر میں بڑی ہوتے ہوئے بھی اس وجہ سے غیر شائستہ اور 'پھوہڑ' عورت کے طور پر پیش کی گئی ہے چونکہ وہ علم کے زیور سے آراستہ نہیں ہے۔گھرگر ہستی اس کے لیے موزوں ہی نہیں اسی لیے وہ اپنے مائیکے والوں سمیت سسرال میں بھی قابل قدر نہیں سمجھی جاتی۔ گویا اس کا تعلیم یافتہ نہ ہونا ان کا ننگ اور عار ہے ، بڑی ہے اس لیے اس کے لیے نام بھی 'اکبری' استعمال کیا گیا ہے۔ بطور ناول کے ایک کردار کے ، اکبری نہایت نا پسندیدہ کردار سمجھا جاتا ہے،جو آج دن تک اپنی غیر شائستگی اور پھوہڑ پن کے باعث ،بد تہذیبی کا ایک نشان ہو کر رہ گیا ہے۔ اس ناول میں اکبری کے ارد گرد ،گھر کے افراد سمیت ایک دنیا ہے جو، اسے سمجھانے اور سلجھانے کی کوشش کرتی ہے مگر، ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا، تو کیا ، ہمارے بڑے بزرگوں کی تجربے بھری باتوں اور عملی زندگی کے علاوہ ،علم کس شے کا نام ہے، اور خاص طور پر جب یہ عملاً عورتوں کی زندگی اور تربیت سے متعلق ہو،مگر اکبر ی ان سب افراد کی نصیحتیں سمجھنے سے قاصر ہی نظر آتی ہے، تو خرابی کہاں ہے ، تربیت کے ادارے یعنی گھرمیں ؟ تربیت کرنے والے یعنی گھر کے تجربہ کا ر افراد اور بزرگوں میں ؟اگر ایسانہیں تو پھر یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے میں تربیت کیوں غیر موجود اور غیر مؤثر نظر آتی ہے۔کیا اس زمانے میں گھر بطور' تربیتی اِدارہ ' کے ناکام ثابت کیا جارہا تھا یا کم ازکم اسے تربیت کے لیے ناکافی ثابت کیاجارہا تھا اور اگر گھر اور خاندان ادارے کے طور پر اپنی اہمیت کھو رہے تھے تو ان کی جگہ (Replacement) کون سے دیگر اِدارے لے رہے تھے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیّر نے اپنے مضمون''معنیِ واحد اور معنیِ اضافی کی کش مکش'' میں لکھا ہے کہ:

''یورپی تہذیب کی آفاقیت کا کبیری بیانیہ اگر کسی ایک' جگہ' سب سے زیادہ برگ و بار لایا تو وہ نئے تعلیمی نصابات تھے۔ نذیر احمد کے پہلے تینوں ناول (مرأۃا لعروس،بنات النعش اور توبتہ النصوح)اس نئے تعلیمی نصاب کے سلسلے کے تحت لکھے گئے ،جس کا آغازدھرم سنگھ کا قصہ(۱۸۵۱) ،سورج پور کی کہانی(۱۸۵۲)،خطِ تقدیر (۱۸۶۲)،نیرنگِ نظر(۱۸۶۴)،داستانِ جمیلہ خاتون(۱۸۶۵) اورجواہر الاصل(۱۸۶۵)جیسی کتابوں سے ہوا تھایہ تمام قصے کہانیاں یا تمثیلیں اخلاقی نوعیت کی تھیں اور نئے مدارس کے لیے تھیں ۔ہیئت کے اعتبار سے 'پرانی' یعنی مشرقی تھیں ،مگر مواد کے اعتبار سے 'جدید' یعنی یورپی تھیں ۔''(۴(

'مرأۃالعروس' کی کہانی میں دوسرا اہم نسوانی کردار اکبری کی چھوٹی بہن 'اصغری' کا ہے۔ اصغری کو نذیر احمد نے سگھڑاپے کی علامت کے طور پر پیش (Paint) کیا ہے ، اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اصغری ان تعلیمی مراحل سے گزر چکی تھی جسے ، نذیر احمد ' تعلیم' کہتے ہیں ، اور یہ تعلیم انگریزی نوآبادیاتی نصاب کے زیر اثر فروغ پا رہی تھی ، ورنہ عورتوں کی تربیت کا کوئی تو سلسلہ ہندستان میں رائج تھا جہاں ، معاشرے کی بہو بیٹیاں ، عقل و شعور حاصل کرتی تھیں

، وگرنہ بصورت دیگر ، معاشرے کا تحرک کیسے جاری تھا، اگر معاشرے کا ایک بڑا افرادی حصہ ، (عورت) محض جاہل رہے تو معاشرہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔

نذیر احمد کے اس ناول میں 'اکبری' ایک حرکت کی مثال ہے اور یہ حرکتِ زیبا نہیں بلکہ ہندستانی تہذیبی حوالے سے 'انتہائی نازیبا 'ہے، خاص کر جب اس کو عورت کے روپ میں پیش کیا گیا ہو،کیوں کہ عورت کو زیبایش کی ایک مثال ہی تو سمجھا جاتا ہے ، کیا ہندستان اور کیا اس کے آس پڑوس۔'اکبری' کی یہ نا زیبائی ایک خاص طرح کی رونق کا باعث بھی نظر آتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اکبری کا کردار یہاں باوجود اپنے پھوہڑ پن کے ایک پُر رونق کردار بھی دکھائی دیتا ہے، جو اصغری کی نسبت زیادہ تحرک کا باعث بھی لگتا ہے۔قاری یہ بھی محسوس کرتاہے کہ اکبری اور اصغری اپنی خوبیوں اور خصائل کی بنا پر ایک دوسرے کی ضد ٹھہرتی ہیں اور اس زمانے کا قاری جو کہ اس ناول کو بڑے زور و شور سے پڑھ رہا تھا وہ یقینی طور پر دونوں کی سماجی حیثیت اور ان کے اطوار کے باعث ان کی اپنی الگ الگ خوبیوں اور خامیوں سے باخبر تھا ، اصغری کو حاصل ہونے والی عزت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور ویسی ہی مثال اپنے گھریلو ماحول میں دیکھنے کا خواہاں تھا، یہی وجہ اس کی دلچسپی کی تھی کہ؛ اپنے گھریلو ماحول اور اس ماحول میں ، جو اس ناول میں بطور آئیڈیل پیش کی گیا ہے تقابل کرتا دکھائی دیتا ہے۔ڈپٹی نذیر احمد کا دوسرا ناول ''بنات النعش'' ہے جو ۱۸۷۲ء میں لکھا گیا۔ یہ ناول گزشتہ ناول کا ہی تسلسل دکھائی دیتا ہے، اس کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا کہ فاضل مصنف ایک ہی طویل تجربے کو مختلف انداز سے بیان کر رہے ہیں ،

''نذیر احمد کی یہ تصنیف ان کے پہلے ناول'' مرأۃ العروس '' کے مقصد کا تکملہ ہے '' مرأۃالعروس'' میں خانہ داری اور تعلیم کے چند بنیادی و عینی تصورات کو ابھارا گیا تھا۔''بنات النعش'' میں ایک زندہ جیتے جاگتے کردار حسن آرا کی انھیں خطوط پرایسی تعلیم و تربیت کی جاتی ہے کہ وہ خود ایک مثالی عورت بن جاتی ہے ۔اس سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ ان نئے تصورات کا اطلاق ہمارے اپنے معاشرے کی لڑکیوں پر کرکے انھیں ایسا سدھاراجاسکتا ہے کہ وہ خود دوسروں کے لیے ایک نمونہ ، ایک مثال بن جائیں ۔''(۵(

نذیر احمد کے ناولوں سے اردو ادب میں گویا ایک طرح کی روایت کا آغاز ہوا اور وہ وجہ ان کے ناولوں کا مقبولِ عام ہونا تھا ان سے قبل لکھے گئے ناولوں کو وہ قبول عام حاصل نہیں تھا ، حتیٰ کہ ان کے ناولوں کے تتبع میں ۔''رشید النساء'' نے ایک ناول لکھا جس کانام'' اصلاح النساء'' تھا، اصلاح النسا کا سن اشاعت ۱۸۸۱ء تھا ، اور رشید النساء نے بھی اعتراف کیا کہ نذیر احمد کے ناولوں نے معاشرے کو ایک اصلاح نسواں کے حوالے سے خاصہ متاثر کیا تھا۔ نذیر احمد نے ناول کو عام قاری کے لیے جس طرح پیش کیا اور داستانوں کے مخالف ان میں عام آدمی کو جس طرح پیش کیا ، یہ ایک بڑی وجہ تھی کہ عام قاری اس سے متاثر ہو رہا تھا۔ایک خاص حوالے سے دیکھا جائے تو یہ عام قاری کے لیے ہی لکھا جارہا تھا اور وہ 'خاص حوالہ' بھی عام قاری ہی ہے یعنی اس دور میں سب سے اہم بات، ہندستان کے عام باشندوں کو مخاطب کرنا تھا اورانھیں احساس دلانا تھا کہ وہ ''عام ''

افراد کے سوا کچھ نہیں ہیں اور ان کی بقا بھی اسی میں ہے کہ وہ اس بات کا ادراک کر لیں کہ انھیں اس نو آبادی میں ایک عام فرد کے طور پر ہی رہنا ہے ۔عام قاری کو یہ باوَر کیوں کروایا جا رہا تھا، یہ سوال اپنی جگہ ایک اہم گتھی ہے جسے سلجھنا چاہیے، تاہم یہ گتھی تبھی سلجھ سکتی ہے ، جب ہماری نگاہیں نوآبادکاروں کی ان پالیسیوں پر رہیں ، جن کے لاگو کرنے سے یہاں کے باشندوں کے تشخص کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا، جن سے ، ان کی زبان چھن گئی تھی؛ زبان اپنی پہچان یا شناخت دوسروں تک منتقل کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہوتی ہے یا یوں کہیے کہ زبان سے افراد دوسروں سے متعارف ہوتے اور اپنا تعارف ان تک منتقل کرتے ہیں ۔ ہندستان میں انگریزی زبان کو علم و فنون کے حصول کے لیے اس طرح لازم کر دیا گیا تھا کہ جسے یہ زبان آئے گی وہ ہی تعلیم اور وظائف کا حق دار ٹھہرے گا۱۸۲۹ء میں انگریزی کو ہندستان کی سرکاری زبان قرار دے دیا گیا تھااور تعلیم کے نام پر تمام بجٹ انگریزی کی لازمی تعلیم سے مشروط کر دیاگیا تھاہندستان میں دو طرح کے طبقات واضح طور پر سامنے آرہے تھے ،ایک تو انگریز کے وفادار اور بدلے میں مراعات یافتہ اشرافیہ کا طبقہ تھا اور دوسری طرف عام ہندستانی باشندے، جن کو زندگی کے تمام بنیادی مسائل کا سامنا تھا، اس طرح سماج میں جو دوئی پیدا ہو چکی تھی ، وہ سماج کی جڑوں کو مز ید کھوکھلا کرنے کے لیے کافی تھی۔

ایسے میں نذیر احمد کس کو مخاطب کر رہے تھے؟ تو اس کا جواب ہے کہ عام آدمی کو ، اس کے لیے عام آدمی کو ہی مثال بناکر پیش کیا جارہا تھا، گویا عام آدمی ، عام آدمی کا مخاطِب بھی تھا اور مخاطَب بھی۔اس طرح بات عام آدمیوں کے بیچ شروع ہوکر یہیں کہیں درمیان رہ گئی تھی، اب عام آدمی کا دھیان ، نوآبادکاروں کی طرف سے ہٹایا جا ئے تو بدلے میں کہا ں لگایا جائے ، تو اس کا بہترین حل تھا 'مذہب'۔اصلاح کے حوالے ، مذہب کی عمل داری ،اور دین داری کی برکتیں ، ہندستان کے اسلامیان کے لیے پہلے کہاں تھیں ، جب کہ یہاں صدیوں سے ان کی حکومت چلی آتی تھی، اور جس شدت سے دین داری اور مذہب کی تبلیغ نذیر احمد نے اپنے ناولوں کے ذریعے کی اس کا ڈسکور س کیا تھا،نذیر احمد کی مذہبی تبلیغ میں جو ایک ایجنڈہ کارفرما نظر آتا ہے ، اس کے مقاصد سمجھنے سے ہمیں اس دور کے ناول خاص کر نذیر احمد کے نالوں کا بیانیہ سمجھ آجا تا ہے۔ ''توبۃ النصوح'' کاایک ٹکڑا دیکھیے:

''نصوح: صلاح یہی ہے کہ جو ہونی ہو سو ہو ،اب نرمی اور لینت نہیں کرنی چاہیے ۔معاذاللہ ایسا برا عقیدہ ! بھلا کوئی کہ سکتا ہے کہ یہ کسی اہلِ اسلام کے خاندان کی لڑکی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ خدا اِس کے نذدیک کوئی چیز ہی نہیں ۔ مجھ کو تو اس کے ساتھ کھانا حرام ہے۔بڑی خیریت گذری کہ میں وہاں موجود نہ تھا ورنہ میرے روبرو ایسا کلمہ اس کے منہ سے نکلا ہوتا تو شاید میں تلوار کھینچ مارتا۔ ایسی اولاد کے ہونے سے نہ ہونا اچھا۔''(۶(

اسی طرح ''توبۃ النصوح ''کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

''نصوح: شاعری اپنی ذات سے بری نہیں بلکہ اس اعتبار سے کہ زبان دانی کی عمدہ لیاقت کا نام شاعری ہے ، ضرور تعریف کی بات ہے ۔ لیکن لوگوں نے ایک عام دستور قرار دے رکھا ہے کہ اس

لیاقت کو ہمیشہ برے اور بے ہودہ خیالات میں صرف کرتے ہیں ۔ اس وجہ سے دین داروں کی نظر میں شاعری عیب و گناہ ہے۔ اب شاعری اسی کا نام ہے کہ کسی کی ہجو کہیے کہ وہ داخل غیبت ہے؛یا مدحِ بے جا لکھیے کہ وہ کذب و بطالت ہے؛یہاں عشق و عیاشی کے ناپاک خیالات میں کوئی مضمون سوچیے کہ وہ خلاف شریعت ہے؛یا مسائل دین اوراہل دین کے ساتھ تمسخر و استہزا کیجیے کہ وہ کفر و معصیت ہے۔''(۷(

نذیر احمد کے تخلیق کردہ ان مکالمات سے بخوبی اندازہ ہو تا ہے کہ یہ کسی مقصدیت اور ارادے کے زیر اثر لکھے گئے ہیں ، اور ان میں مذہب کی افادیت اس طرح بیان کی گئی ہے جیسے کسی نئے مذہب کی اتباع کی کوششیں کی جارہی ہیں اور اگر یہ کوششیں کامیاب نہ ہوئیں تو خدا نخواستہ اس نئے دین کو کچھ نقصان کا اندیشہ ہے، ایسے مکالمات لکھتے ہوئے نذیر احمد شاید اس بات کو بھول گئے کہ اسلامیان ہند کی رگوں میں بھی اسلام ہی دوڑ رہا تھا ، تو پھر ایسی کوشش کیوں کی جارہی تھی اور کیا یہ کوشش خالصتاً اسلام کے پرچار کے لیے جاری تھی یا ہندستان کے عام باشندوں کو ، جو اصل میں صدیوں کے تجربے سے یہاں مل جل کر رہ رہے تھے، اس قابل کیا جا رہا تھا کہ مستقبل میں ، کسی بھی وقت اگر ان کو ایمان اور دین سے وفاداری کے نام پر لڑانا پڑے تو صدیوں سے ایک دوسرے کو قبول کیے ہوئے یہ باشندے ،خود ایک دوسرے کو ہی اس طرح سے رَد کر دیں ، جس طرح ،نصوح کی بیوی فہمیدہ (جس کو اسم بامسمیٰ ثابت کیا جارہا تھا) نے اپنی اولاد کو رَد کر دیا ہے، اولاد کو رَد کرنا اور سماج کو رَد کرنا یکسر دو مختلف عوامل ہیں ، دونوں کی شدت (Intensity)ایک دوسرے سے قطعی طور پر مختلف ہے۔سماج کی پہلی اکائی) Unit) فرد اور پہلا مجمو عہ (Group)خاندان ہے۔یہیں سے سماج کی بنیاد فراہم ہوتی ہے اور سماج تشکیل پاتا ہے۔

نو آبادیاتی باشندے شاید نہ سمجھ سکیں ، مگر نوآباد کار یہ جانتے تھے کہ یہ معاملہ راتو رات وقوع پذیر نہیں ہوا ، بلکہ اس سطح پر جذبوں کو بے وقعت کرکے ، انھیں متشدد رویوں میں تبدیل کرنے میں ان کی کس قدر قوت، اور دماغ صرف ہوا ہے،نوآبادکاروں کا کوئی جذبہ اپنے نوآبادیوں کے باشندوں کے لیے موجود ہی نہیں ہوتا، ان کے ہاں ایک ہی نفسیات ہوتی ہے ، کہ کسی بھی ممکنہ طریقے سے ان باشندوں کو جو، اُن کے لیے بے وقعت ہوتے ہیں ، اس طاقت کے حصول سے انھیں روکا جائے ، جو اِمکانی سطح پر ان کے مخالف استعمال ہو سکتی ہواور اس کے لیے ان باشندوں کو ذہنی اور جذباتی ہر دو سطحوں پر منقسم رکھنا ضروری ہو تا ہے ۔ ہندستان میں بھی نوآبادکاروں نے یہی کیا یہاں بھی ایسا کرنا ان کی سیاسی اور معاشی مجبوری تھی،کیوں کہ ان کی حاکمیت کو کسی بھی خطرے کا سامنا ہو سکتا تھا ، جیسا کہ ہندستان کے مختلف حصوں میں ہونے والی مزاحمت اس امر کا ثبوت بھی ہے۔

ہمارے مصلح اور راہبروں کے پاس نوآبادکاروں کے مقابل کوئی مثالیہ موجود نہیں تھا اور یہ ماضی میں پناہ لینے پر مجبور تھے، ماضی سے بھی جو اَمثال انھوں برائے تقلید منتخب کیں ان کا اس سر زمین سے کوئی تعلق نہیں تھا، عرب و عجم کی کہانیاں ہندستان میں زیادہ مؤثر ثابت نہ ہو سکیں ، اور ہمارے راہبر اسی طرح کی تصویر کشی میں مصروف تھے :

''کلیم کو اپنے جن امتیازات پر ناز ہے ان میں شعر و شاعری ، شطرنج ، چوسر ، گنجفہ، پتنگ بازی اور کبوتر بازی اور اس نوع کی مختلف سر گرمیاں شامل ہیں جو اس زمانے کے معاشرے میں مردوں کے محبوب مشغلے شمار کیے جاتے تھے اور جن میں فوقیت، کمال، اور برتر ی حاصل کرنا منتہائے مقصود سمجھا جاتا تھا ۔ ترغیبات جنسی کا البتہ کلیم کے ہاں کوئی گزر نہیں ہے اور ان کا کوئی تذکرہ یہاں نہیں کیا گیا۔''(۸(

مذہب اور کلچرکو اس طرح الجھایا گیا کہ ؛مذہب کی بنیادیں اپنی پہچان سمیت گم ہونے لگیں اور کلچر کی غلط تعبیر سے ہندستانی معاشرے کو اس طرح گم راہ کیا گیا کہ صدیوں پرانی روایت سے مقامی باشندے متنفر ہونے لگے، یا انھیں ایسا کرنے کی کوشش کی گئی، اس میں نو آبادکاروں کی چال کہیں کامیاب اور کہیں مزید الجھتی رہی، لیکن اس سے نقصان صرف مقامی باشندوں کا ہی ہوا۔مذہب اور کلچر کی غلط تعبیر سے، ہندستان میں فرد کی انفرادی اور شخصی حیثیت کو سخت نقصان پہنچا۔ ہر انفرادی حیثیت کی عادت کو ، معاشرے کی اجتماعیت کے برابر رکھ کر دیکھا جارہا تھا یا اس کی پاکیزگی اور ایمان کی سَند مذہب سے طلب کی جا رہی تھی۔ ہندستان کے انتہائی مخلوط معاشرے میں فردکی ذات کو چیلنج کیا جا رہا تھا جو معاشرتی سطح پر ہمیشہ تباہ کن اثرات مرتب کرتا ہے۔لہٰذا،ہندستان میں بھی یہی ہوا ، اور یہاں مذہب کی نئی اور مقامی تشریحات نے پہلے مذہبی گروہ بندیوں کو جنم دیا اور بعد اَزاں ان گروہ بندیوں سے ملک اور ملت کے نئے معانی متعین ہونے لگے ۔ کہیں ملک اور اس کا نظام خالصتاً سیاسی نظریے کی رُوسے یکھا جا رہا تھا اور کہیں یہ انتہائی مذہبی حوالہ تھا،بہر حال نوآباد کاروں نے یہاں کے مذہبی عناصر کو جس طرح ان کے اپنے اپنے مذہبی عقائد اور تصور قومیت میں الجھایا، اس کی مثال برعظیم میں اس سے پہلے نہیں ملتی۔

کلیم کے کردار کی خوبیاں اور خامیاں کردارسے زیادہ معاشرت کی عکاسی کرتی ہیں ، اورایسے معاشرتی خصائص ، نوآبادیاتی دور کے آغاز سے یا اس کے دوران پیدا نہیں ہوئے جو نثر نگاروں اور شاعروں کو معائب کے طور نظر آرہے تھے اور نہ ہی ان کو مذہبی حوالے سے جوڑ کر دیکھا جانا چاہیے،کبوتر بازی ، پتنگ بازی یا اسی قسم کی کسی دیگر سرگرمی کا تعلق مذہبی عقائد سے کیوں کر ہوا، یہ کام تو ہندو ، سکھ ، عیسائی یا کوئی بھی دیگر مذاہب کا پیرو بھی کر سکتاتھا، پھر ان کی مذمت مذہبی حوالوں سے کیوں کر کی جارہی تھی۔ای۔ ایم ۔ فاسٹر کے بقول ''ناول نگار کرداروں کے ذریعے ہم سے کلام ہوتا ہے''(۹) تو نذیر احمد اپنے کرداروں کے حوالے سے جو کلام کر رہے تھے، اس کلامیے سے مذہب اور ثقافت کا جو الجھاؤ پیدا ہونے جا رہا تھا اور جس کا منطقی انجام برعظیم کی اقوام کے آپس میں ٹکراؤ پر ہی منتج ہوتا دکھائی دے رہا تھا تو کیا نذیر احمد اس سے ناواقف تھے؟

نذیر احمد کی نیک نیتی پر شبہ کیے بغیر ، ان کے ناولوں اور ان کے کرداروں کے جائزے سے جو بات سامنے آتی ہے ، وہ یہی ہے کہ اس ساری تخلیقی صورت حال کا فائدہ بہر حال انگریزوں کو ہی ہوا۔ ای۔ایم ۔فاسٹر کا کہنا ہے کہ ؛ ناول نگار ایک شعوری کوشش کے ساتھ اپنے ناول کا خاکہ پہلے سے تیار رکھتا ہے، نذیر احمد کے حوالے سے ہم اس حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ؛ اصلاح ملت کا

معاملہ تھا۔اس لیے ان ناولوں کے 'شعوری' ہونے پر کسی کو اعتراض نہیں ہے۔ توبۃ النصوح کے بنیادی خاکے ،کو پہلے سے متعین قرار دیتے ہوئے اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں :

''ناول کا آغاز اور انجام پہلے سے متعین معلو م ہوتے ہیں ۔ نصوح اور اس کی بیوی فہمیدہ کا اپنے ماحول میں ، جو انھی کا پیدا کیا ہوا ہے ، گہری تبدیلی لانے کا عزم سمیم اس کے خلاف بڑے لڑکے کلیم اور بری بیٹی نعیمہ کی مزاحمت اور مخالفت اور دریدہ ذہنی کا مظاہر ہ ، نعیمہ کا دیر تک اپنی ضد اور ہَٹ دھرمی پر قائم نہ رہنا ، اس کے بالمقابل کلیم کی ترنگ لاف زَنی اور اس کا تشدد اور لہو و لعب میں نہ صرف غرق رہنا بلکہ اسے حق بجانب ثابت کرتے رہنا اور تاویلات بے جا سے کام لینا اور باپ کے ساتھ انتہائی بد تمیزی اور بد تہذیبی کے ساتھ پیش آنا اور پھر زندگی کے آخری لمحات میں ، پشیمانی کا احساس او ر معافی طلب کرنا، اور اس طرح ناول کا خاتمہ بالخیر۔''(۱۰(

لہٰذا یہ عام خیال ہے کہ اصلاح معاشرہ یا ملت کے باب میں ایسے ناول اورکردار شعوری طور پر تخلیق کیے گئے، اور ان کے عقب میں غیر محسوس انداز میں نوآبادکاروں کا تعلیمی ایجنڈا ہی شامل تھا یا کم از کم ان ناولوں کی تخلیق سے اسی ایجنڈے کی ہی تکمیل ہوئی۔قاری کو مخاطب کرکے اس کے نئے ذہن کی جو تربیت کی جارہی تھی ، آیندہ میں اس کی تخریب کا سامان بھی موجود تھا۔ نذیر احمد بھلے نوآبادکاروں کے آلہ کار نہیں تھے ، اور وہ اپنی سمجھ بوجھ سے ، اس زمانے کے لوگوں کی راہنمائی میں مصروف تھے،لیکن اس زمانے کی جو معروف رَو تھی ، وہ اس میں غیر ارادی طور پر شامل بھی تھے، اور وہ رَو نوآباد کاروں کی ہندستان میں ، قدیم اور رَوادار ذہن کو تبدیل کرکے اس کو متشدد رَویّے سے رُوشناس کروانا تھا۔

نذیراحمدنے ''ابن الوقت'' ۱۸۸۸ء میں لکھا۔اس ناول میں جہاں پہلے ناولوں کی طرح مذہبی رجحان پیش کیے گئے ہیں ، وہاں اس دور کے سماجی اور بالخصوص سیاسی حالات کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ عام تاثر یہ ہے کہ 'ابن الوقت' سر سیّد کی انگریز ی حمایت کے خلاف لکھا گیا ہے۔ سبط حسن نے 'ابن الوقت' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

''یہ کتاب ایسے زمانے میں لکھی گئی تھی جب سرسیّد کی تحریک عروج پر تھی۔ مسلمانوں کا ایک گروہ سرسیّدکی تعلیمات کا حامی تھا اور ان کی سرگرمیوں میں ان کا ساتھ دیتا تھا؛ان میں مولانا حالیؔ، مولانا شبلیؔ، نواب محسن الملک وغیرہ پیش پیش تھے۔ دوسرا گروہ سرسیّدکی تعلیمات کا شدت سے مخالف تھا اور ان پر کفر و الحاد کے فتوے صادر کرتا رہتا تھا۔ اس گروہ میں بعض علماے دین کے علاوہ مولوی نذیر احمد اور اکبر الہ آبادی بھی شامل تھے جو سرسیّد کو کافر نہ سہی، گمراہ ضرور سمجھتے تھے۔''ابن الوقت''میں مولوی نذیر احمد نے سرسیّد اور ان کے عقائد کا خاکہ اُڑایا ہے''(۱۱(

نذیر احمد کے ناول 'ابن الوقت' کا عنوان بہت اہمیت کا حامل ہے اور اس کے مرکزی کردار کے بارے میں قبل از جائزۂ ناول، قاری کے ذہن میں کردار سے متعلق ایک منفی تاثر ضرور ابھرنے لگتا ہے کہ ؛ یہ کردار یقینی طور پر ، موقع پرست ، اور لالچی قسم کا واقع ہوگا۔پھر اس ناول کی تخلیق کے بعد اس کردار سے متعلق عام آدمی کا تاثر بھی اچھا نہیں تھا ، حتیٰ کہ موقع پرست انسان کے لیے 'ابن الوقت' ایک محاورے کے طور پر مستعمل ہے۔

نذیر احمد کا مطمحِ نظر جو بھی رہا ہو، مگر ابن الوقت کا قاری ،ناول کے آغاز پر ہی اس بات کی حقیقت تک رسائی حاصل کرلیتا ہے کہ؛ ناول کے آغاز میں جو منظر نامہ پیش کی گیا ہے وہ ۱۸۵۷ء کی تاریخ کی درست عکاسی بھی ہے۔اس میں نوآبادکاروں کے مظالم کی داستان جس انداز میں بیان کی گئی ہے ، وہ تاریخی اعتبار سے قرین قیاس ہے، کیوں کہ اس زمانے کی تاریخ کے اوراق ایسے واقعات سے بھرے پڑے ہیں ، جن کو نذیر احمد نے' ابن الوقت' میں بیان کر دیا ہے۔ اب یہ محض تاریخی حوالہ ہی نہیں بلکہ اس ناول کا حصہ بھی ہے۔مگر، تاریخ کی بدصورتیاں جس انداز سے مطالعہ تاریخ کے دوران ہمارے سامنے آتی ہیں ۔ ناول کے بیانیے سے ان واقعات کا اثر دونا ہو کر قاری پر طاری ہوتا ہے:

''ابن الوقت: نہیں جناب جب قلعے پر توپیں چڑھائی گئیں تو بہت سی بیگمات بلکہ مرشد زادے حضور والا میں فریاد لے کر آئے تھے کہ ہم کو ڈر لگتا ہی۔۔۔۔نوبل صاحب کو معلوم تو ہو ہی گیا تھا ، فرمانے لگے کہ بیگم صاحب کے انتقال کا مجھ کو سخت ملال ہے، اور آپ سے جس قدر میں نے ان کی مدح سنی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی نیک دل ملکہ تھیں ، مگرایسے وقت کا مرنا ، میں ان کی خوش نصیبی کی دلیل سمجھتا ہوں ،کیوں کہ آپ کے جہاں پناہ نے اپنے ساتھ نسل تیمور اور تمام خاندان شاہی بلکہ شہر کے برباد اور تباہ کر دینے میں کوئی دَقیقہ اٹھا نہیں رکھا ۔'' (۱۲(

انگریز کی ہندستان پر قبضے کی داستا ن تو کسی طور سکون بخش نہیں ہے ، البتہ ۱۸۵۷ء کے بعد کی اِضطراری حالت تو قاری کو اس قدر بے چین رکھتی ہے کہ جیسے یہ سب ماجرا س کی آنکھوں کے وقوع پذیر ہو رہا ہے۔ہندستان میں عام باشندوں کی ابتری کا عالم کیا ہوگا ، جب کہ نسلِ سلاطین کی آہ و زاری اور بے بسی کی صورت ِحال بھی خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیتی ہے، آج ڈیڑھ صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ، وہ منظر نامہ، آج کے قاری کو ویسے ہی تڑپاتا ہے جیسے اس دور اور تہذیب کے قاری کو مضطرب کیا ہوگا۔ مثال ملاحظہ کیجیے:

''جس دن قلعہ شاہی پر گولے برسنے شروع ہوئے، فوجِ باغی کا ضعف اور اہل شہر کا ہراس کھل پڑا۔لوگ لگے مال و متاع گھر بار چھوڑ چھاڑ کر بھاگنے اور گولوں نے بھی یہ غضب ڈھانا شروع کیا کہ کلکتے دروازے سے لے کر لاہوری دروازے تک شہر کے شمالی حصے میں شاذ و نادر کوئی مکان ان کے صدمے سے بچا ہو تو بچا ہو ورنہ سارے دن اور ساری رات ہر طرف سے یہی آواز چلی آتی تھی ،''پُھٹ اُڑا ڑا ڑا دَھوں ۔۔۔ فتح مند فوج کا دشمن کے شہر میں داخل ہونا گویا ایک عذاب کانازل ہونا ہے۔سامنے پڑا ہوآدمی بچ نہیں سکتا اور میں امید کرتا ہوں کہ شہر کے فتح ہونے سے پہلے میں آپ کی حفاظت کا انتظام کر سکوں گا۔''(۱۳(

نذیر احمد نے ابن الوقت میں کرداروں کے ذریعے انگریزی رہن سہن ، اور اندازِ بود و باش کا تمسخر اڑایا ہے اور انگریزی اندازِزندگی اپنانے سے نوجوان نسل کو،مصنف نے اپنے تئیں روکنے کی کوشش کی ہے ، سوال یہ ہے کہ کیا یہ ایک سنجیدہ کوشش تھی، کسی کلچر کا تمسخر بنا کر ، اس کے پھیلاؤ کا راستہ روکا جاسکتا ہے،اور اگر روکا جاسکتا ہے تو پھر برعظیم میں ایسا کیوں نہ ہوسکا،اور اگر ایسا ممکن نہیں ہے تو پھر ایسی کوشش کو ہم سنجیدہ کن بنیادوں پر کہ سکتے ہیں

؟سرسیّد اور ان کی تحریک کے حوالے سے کوئی ایک رائے نہیں ہے۔ ہندستان کی تحریکوں میں غالباً یہ سب سے زیادہ متنازع تحریک کہی جاسکتی ہے۔ یہی حال اس تحریک کے اثرات اور اس کے متعلقات کا تھا،نذیر احمد کی شخصیت اور ان کے ناول باوجود صد اعتراضات و انکار ،سرسیّد کی تحریک اور شخصیت سے ہی جڑے نظر آتے ہیں اور ان کی تعبیر و تشریح بھی سرسیّد کی تحریک سے الگ نہیں کی جاسکتی۔

حوالہ جات:

)۱(افتخار احمد صدیقی،ڈاکٹر، مولوی نذیر احمد دہلوی(احوال و آثار)، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۲ء، ص ۳۸۳

)۲(ڈپٹی نذیر احمد، ''دیباچہ''، مرأۃالعروس، کراچی :تاج کمپنی لمیٹڈ، ۱۹۷۸ء ، ص۳-۴

)۳(جمیل جالبی،ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو،جلدچہارم، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۲ء، ص ۱۱۴۱

)۴ (ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر ، ''معنیِ واحد اور معنیِ اضافی کی کش مکش، نذیر احمد کے توبتہ النصوح کا مطالعہ''، مشمولہ، اورینٹل کالج میگزین، لاہور:

)۵(جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو ،ص ۱۱۴۵

)۶(ڈپٹی نذیر احمد، توبۃ النصوح، لاہور: مجلس ترقی اد ب، ۱۹۹۴ء، ص۱۹۲

)۷(ایضاً ، ص۳۳۸

)۸(اسلوب احمد انصاری، اردو کے پندرہ ناول، لاہور: مکتبہ قاسم العلوم، س ن، ص۵۱

)۹(ابوالکلام قاسمی،مترجم ‘ناول کا فن،ای-ایم-فاسٹر؛ آسپیکٹس آف دی ناول، علی گڑ ھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس۲۰۰۱ء، ص۶۸

)۱۰(اسلوب احمد انصاری، اردو کے پندرہ ناول،ص۵۰

)۱۱(سبط حسن، دیباچہ ،ابن الوقت، لاہور: مجلس ترقی ادب،ص۴،۵(ط(

)۱۲(ڈپٹی نذیر احمد،ابن الوقت، لاہور: مجلس ترقی ادب‘ص۳۱

)۱۳(ایضاً ، ص۳۲-۳۳

/...../